خطبۂ صدارت

اردو کانفرنس

منعقدہ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء

بمقام لکھیم پور

از

اسد اللہ کاظمی

خطبۂ صدارت

اُردو کانفرنس

منعقدہ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء ـ بمقام لکھیم پور

حضرات!

بڑوں سے رسم کچھ یوں ہی چلی آئی ہے کہ خطبۂ صدارت اپنی کم مائیگی اور ہیچمدانی سے شروع ہوکر شکریہ اور سپاس کے دل آویز منازل طے کرتا ہوا کانفرنس کے راگ گاتا ہوا کچھ ارشادات اور فرمودات پر ختم ہوجاتا ہے۔ کہنہ مشق یا بقول رشید صاحب "پیشہ ور صاحبِ صدر" ان تمام مقامات کو ہوا کی طرح نہایت سبک روی سے طے کرلیتا ہے۔ جادۂ منزل اسکے لئے مشق دیا ماندہ۔ آئین راہ نوردی اس کو ازبر۔ یہ مشاق اور پختہ کار رہرو اس طرح اس میدان سے گزر جاتا ہے کہ قدم تو قدم، بسا اوقات تو مژگانِ چشم کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ سرگشتگیٔ رسوم و قیود کی یہ سہل آفرینی میرے لئے کس درجہ سبق آموز تھی۔ لیکن میں ٹھہرا مبتدی۔ آئین و رسم راہ سے نابلد۔ اصول رہ روی سے ناواقف منزل کے کوائف سے ناآشنا اگر اس میدان میں نہ بھٹکوں تو یقین کیجئے کہ یہ آپ کے نظرِ کرم اور نظرِ انتخاب کا معجزہ ہوگا!

تقاضائے رسم و مصلحت تو یہ تھا کہ آپ اس کانفرنس کی صدارت کے لئے کسی ایسی ہستی کو منتخب کرتے جسکی کوئی سیاسی یا ادبی حیثیت ہوتی۔ کسی ایسے صاحب بصیرت کو چنتے جس کی نظر مقامی اور وقتی مصالح اور اغراض کی ماورائیت سے بھی دوچار ہونیکی ہمت رکھتی۔ لیکن آپنے انتخاب کیا ایک ایسے گمنام شخص کا جسکی نہ کوئی سیاسی حیثیت ہے نہ ادبی۔ جو نہ صاحب بصیرت ہونیکا دعویٰ کرسکتا ہے نہ "صاحب فردا" ہونے کا۔ جو نہ صاحب فکر ہے نہ صاحبِ علم۔ جو شاید اسکا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ آپکے اس "حُسنِ انتخاب" سے اہل بصیرت کو کتنا شدید گلہ ہوسکتا ہے! بہرحال آپ نے اگر اس رسم کو توڑا ہے تو پھر بسم اللہ کیجئے اور اپنے انتخاب اور میرے انجام بخیر ہونے کے لئے دعا کیجئے!!

مجھے اس کانفرنس کا صدر منتخب کرکے آپ نے نہ صرف میری عزت اور ہمت بڑھائی ہے بلکہ اس عمل کی توقیر سے احساس کا بھی اظہار فرمایا ہے جس کا میں ایک ادنیٰ سا رکن ہوں۔ اسکے علاوہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے جس کا یہ کانفرنس ایک شعبہ ہے ـــ میرا تعلق خاندانی بھی ہے۔ میرے عم بزرگوار جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب قبلہ نے جو خدمات اس کانفرنس کی انجام دی ہیں اور جس انہماک، تن دہی اور ایثار سے اسکے مقاصد کی تشکیل اور تکمیل میں کوشش کی ہے اسکا اعتراف خود آج کانفرنس کی روز افزوں ترقی، ہر دلعزیزی اور کامیابی کرے گی۔ اسلئے یہ احساس میرے لئے باعث صد توانائی ہے کہ گو میں کچھ نہ سہی میری نسبت تو قوی ہے اور یہی نسبت ہے جو اس وادی میں میرے لئے خضرِ راہ اور اس ذمہ داری کے کام میں میری پشت پناہ ہے!

میں نہیں جانتا کہ اس اردو کانفرنس کے مقاصد اور اغراض آپ حضرات نے کیا متعین فرمائے ہیں پچھلے سال

کا خطبۂ صدارت جو میری ہدایت کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے وہ بلحاظ اپنے زورِ قلم، ندرتِ بیان اور وسعتِ مضمون میری بے مائگی کو تو ضرور واضح سے واضح تر کر دیتا ہے لیکن اس باب میں میری کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ ان تجاویز سے بھی جو گذشتہ کانفرنس میں پاس ہوں مجھے کسی ایسے مقصد کا پتہ نہیں چلتا جو اس کانفرنس کی اہمیت اور اُردو کی وسعت کا حامل ہو۔ کچھ تجاویز سے یہ مترشح ضرور ہوتا ہے کہ جو غیر متعلق مقصد، کانفرنس کے مصالح میں کارفرما ہے وہ ہے اُردو اور اسکی تعلیم کو زمانہ اور فرقہ وارانہ دست بُرد سے بچانا۔

حضرات! اُسی نسبت کے سہارے جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں۔ یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ مقصد کچھ اور وسعت اور رفعت چاہتا ہے۔ آپ کو ایک ایسے مقصد کا تعین کرنا ہے جو ایک طرف تو آپ کی اس کانفرنس کے شایانِ شان ہو اور دوسری طرف اُردو کے مزاج اور طبیعت کے موافق اور اسکی آئندہ ترقی اور ترویج کا حامل ہو۔ موجودہ زمانہ میں اُردو کی لسانی اور تاریخی ابتدا اور ارتقا پر کافی کہا جا چکا ہے اُس کو دہرا کر میں آپ کی سمع خراشی نہیں کروں گا البتہ اس کی اجازت چاہتا ہوں کہ اردو کے مزاج اور اس کی افتادِ طبع پر کچھ عرض کردوں۔

کہا جاتا ہے کہ اردو مختلف اللسان قوموں کے ایک جا رہنے سہنے کی وجہ سے وجود میں آئی۔ میں اس قول کی صحت اور صداقت کا منکر نہیں۔ یہ قول غلط تو نہیں ہے لیکن یک رُخا ضرور ہے۔ اور اس ملک کی ذہنی تاریخ کے ایک مہتم بالشان باب کو اگر قطعی نظر انداز نہیں کرتا تو اس پر ایک ایسی نظر فریب روشنی ضرور ڈالتا ہے جو تصویر کے اصلی خد و خال کو واضح کرنے کے بجائے محض اسکے لباس اور سامانِ تزئین کو رونما کر دیتی ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ ایک نئی زبان، نہ محض مختلف زبان بولنے والوں کے اختلاط و ارتباط ہی سے وجود میں آتی ہے اور نہ صرف اُن سماجی اور سیاسی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بنتی ہے جو مختلف اور اجنبی قوموں کے وصل سے ظہور میں آتی ہیں۔ یہ سب باتیں زبان کے ارتقا میں محرک اور مؤید تو ضرور ہوتی ہیں لیکن محض انھیں کی بنا پر ایک نئی زبان تخلیق نہیں ہوتی۔ زبان کی تخلیق کا راز، آپ کو اسکے ملک کے اس نفسیاتی مد و جزر میں۔ اس ذہنی اتار چڑھاؤ میں اور ذہن کے اس شعوری اور غیر شعوری زیر و بم میں ملے گا جو پیش خیمہ ہوتا ہے حیات کے اقدارِ نو کا۔

تنوع اور حرکت، زندگی کے خمیر میں ہے۔ زندگی، سکون اور جمود سے اُتنی ہی بعید ہے جتنا مغرب سے مشرق اور آسمان سے زمین۔ پھر زندگی نام ہے اُن اقدار کا۔ جو سوائے ان چند اقدار کے جو بشریت کے جزو لاینفک ہیں اور انسان اور اس کے خالق کے رشتہ کو مرتبط اور منضبط کرتے ہیں۔ ہمیشہ بدلتے۔ بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ زندگی میں اس لئے ایک منزل وہ بھی آتی ہے جب نئے اقدار کی ترجمانی سے وہ اس لئے عاجز ہو جاتی ہے کہ اس کے پاس ان کی ترجمانی کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ اس کے تمام ادارے اور وسیلے۔ جو

پُرانے اقدار کے آئینہ دار تھے۔ بے معنی، بے کیف، اور رنگ و بو سے یکسر عاری ہوجاتے ہیں۔ اور ان میں جمود افسردگی اور اضمحلال پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے یہاں تک کہ وہ مقام آجاتا ہے جب زندگی بقولِ شاعر "کروٹ بدلتی ہے" اور نئے اقدار کی ترجمانی اور تشکیل کی نئی راہیں تراشتی ہے۔ یہی وہ ذہنی اور نفسیاتی انقلاب ہے جو ہر سیاسی انقلاب کا پیش رو ہوتا ہے۔ زبان بھی اقدار کی ترجمانی اور تشکیل کا ایک زبردست ذریعہ ہے، اور جو زبان اس تشکیل اور ترجمانی کی صلاحیت سے عاری ہوجاتی ہے وہ شل اور ناکارہ انسانی اداروں کے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

حضرات! اس ملک کی زبانوں اور ان کی ابتدا اور ارتقا پر جب ہم اس نظریہ سے غور کرتے ہیں تو تصویر کے وہ اصلی نقوش واضح ہونے لگتے ہیں جو اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ آریوں کا ہندوستان میں آنا ابتدا تھی ایک زبردست ذہنی اور فکری انقلاب کی جس نے اس ملک کے اقدارِ حیات کو بہت کچھ بدل دیا۔ انھیں اقدار کی ترجمانی کے لئے سنسکرت وجود میں آئی اور اس ملک کی نشأۃ ثانیہ کی زبان بنی۔ اور اس وقت تک بنی رہی، جب تک اس میں یہ صلاحیت موجود رہی کہ نئے اقدار کی صحیح اور مکمل ترجمانی کرتی رہے۔ اس طرح صدیاں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ آریوں کی سیدھی سادی تہذیب اور ان کے زرعی اور دیہی تمدن میں تغیر و تبدل لاحق ہونا شروع ہوا اور برہمن سامراجیت میں۔ جو اس تہذیب اور تمدن کا گہوارہ اور اور سرچشمہ تھی۔ اضمحلال اور جمود کے آثار نظر آنے لگے۔ زندگی کے ادارے بے معنی اور بدمزہ ہونے لگے۔ اور نئے اقدار کی تسکین اور ترجمانی ان کے لئے ناممکن ہوگئی۔ قصہ مختصر حیات کے کروٹ بدلنے کا وقت آن لگا۔ اس دور کا تاریخی تعین مشکل ہے لیکن اسکا ایک نفسیاتی معجزہ تھا۔ بدھ مذہب اور اس کا غیر فانی اور مقدس بانی۔ اس نئے زاویہ حیات نے کس طرح ملک کی مذہبی ذہنیت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا اور اس انقلاب کا ملک کے اور اداروں پر کتنا گہرا اثر پڑا۔ یہ اس زمانہ کی تاریخ خود بتائے گی۔ یہاں مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان تمام انقلابات نے حیات کے اقدار بدل دئے اور ان اقدار کی ترجمانی کے لئے ایک نئی زبان یعنی پراکرت وجود میں آئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ برہمن سامراجیت نے اس نئے مذہب اور اس نئی ذہنیت کو اپنا کر اپنا اقتدار اور اثر قائم رکھا اور کچھ مدت کے بعد کم از کم ہندوستان سے بدھ مذہب اور اسکی خصوصی اور انفرادی شان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ لیکن سنسکرت بھی ہمیشہ کے لئے زندہ اور قابل ترقی زبانوں کی صف سے ہٹ گئی۔ رہی یہ بات کہ اس انقلاب کے بعد بھی ایک مدت تک سنسکرت ملک کی مذہبی زبان بنی رہی تو یہ برہمن سامراجیت کی ایک شاطرانہ سیاسی چال تھی۔ جس کی بدولت برہمن آخر تک ملک کا مذہبی پیشوا بنا رہا۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی سنسکرت کا اقتدار بحیثیت ایک زندہ زبان کے آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ اور اسکی جگہ ملک کی اور زبانوں نے لینی شروع کردی۔ یہ زبانیں ترقی

کی راہ پر آگے کیوں نہیں بڑھیں۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ تعلیمی اداروں پر برہمنوں کا تسلط برابر قائم رہا۔ اور دوسری غالباً یہ کہ خود ان زبانوں میں ترقی کی زیادہ صلاحیت موجود نہ تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ اس حیات نو کے اقدار بالیدہ ہو کر پختگی پر پہنچنے لگے۔ اس اثنا میں انقلاب کی کئی اور لہریں بھی آئیں۔ لیکن کچھ تو ملک کی جغرافیائی ہیئت کی بدولت اور کچھ ملک کی نبض حیات کی سست رفتاری کی وجہ سے دسویں صدی عیسوی تک ملک کی نفسیات اور اس کی ذہنی کیفیات میں کوئی خاص اور نمایاں انقلاب رونما نہیں ہوا۔ دسویں صدی البتہ اپنی آغوش میں حیات نو کی ایک ترنگ اور نئی ذہنیت کی ایک لہر لے کر آئی جس نے آہستہ آہستہ ایک موج کی اور موج نے ایک سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان کی ذہنی تاریخ کے لحاظ سے یہ زمانہ عدیم المثال زمانہ ہے۔ ملک کا ملک تہ وبالا ہوتا نظر آتا تھا۔ پرانے اقدار اور جمود پسند خداوندانِ حیات نے کس طرح اور کیوں کر اس سیلاب کو روکنے کے لئے اپنے غیر محدود اثرات کا استعمال کیا اور کس انداز سے نیم مردہ روایات اور نیم جان رسومات کا پشتہ باندھ باندھ کر اس کی تندی اور روانی کا سدباب کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہمارے ملک کی ذہنی تاریخ کا ایک دلچسپ، بصیرت افروز اور سبق آموز باب ہے جس کی وضاحت میرے لئے اس وقت نہ ممکن ہے نہ سودمند۔ مجھے تو صرف یہ واضح کرنا ہے کہ یہ دورِ انقلاب، پچھلے انقلاب سے۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اپنے تاثرات میں کہیں زیادہ شدید اور کہیں زیادہ وسیع تھا۔ اس نے ملک کی حیات کے اقدار میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کر دی اور ایسے نئے اقدار کی بنیاد ڈالی جن کے اظہار اور تسکین کے لئے زندگی کو نئے انداز۔ نئی راہیں۔ نئے اسباب۔ نئے ذرائع اور نئے ادارے فراہم کرنے پڑے اور اردو نام ہے انھیں ذرائع میں سے ایک کا۔ دوسرے الفاظ میں اُردو نام ہے اس زبان کا جو ان اقدارِ نو کی ترجمانی اور تشکیل، اور ان کے اظہار و تسکین کے لئے وجود میں آئی۔

یقین کیجئے کہ اُردو کسی سیاسی یا معاشرتی سمجھوتے کو منضبط کرنے کے لئے یا دو زبانوں کے گنگا جمنی معانقہ و مواصلہ کو مربوط کرنے کے لئے وجود میں نہیں آئی بلکہ ایک ناگزیر ضرورت اور ایک اہم نفسیاتی احتیاج کو رفع کرنے کے لئے اور ایک مہلک، جاں گزا اور حیات سوز کمی کو پورا کرنے کے لئے تخلیق ہوئی۔ اور یہ یاد رکھئے کہ یہ تخلیق نہ ہندو تھی نہ مسلم۔ اسکے ماتھے پر نہ قشقہ تھا نہ نشانِ سجدہ۔ یہ تو اس ملک کے حیاتِ نو کا ایک عکس اور پرتو، اور اس کے اقدار کے ترجمانی کا ایک ذریعہ تھی۔ یہ تو اس انقلاب میں مُضمر تھی جس نے اس ملک کی حیات کو از سرِ نو حرارت، رنگ اور نُو عطا کیا۔ اور یہ اس قومی ذہنیت کی آئینہ دار اور اس قومی سیرت کی عکاس تھی جو اس انقلاب کی وجہ سے وجود میں آئی۔

اُردو میں انقلاب کی ساری کارفرمائیاں تھیں۔ اس میں انقلاب زائیدہ تصور و تخیل اور فکر و نظر کی تمام رنگینیاں اور کرشمہ سازیاں بھی موجود تھیں اور ان سب کے اظہار اور ترجمانی کی ایک زبردست صلاحیت بھی۔

صبر کا دامن سنبھالے ہوئے اب لگے ہاتھوں ذرا اُردو کے مزاج کا تجزیہ بھی مختصراً ملاحظہ کر لیجئے۔ اُردو کے اجزائے ترکیبی ہیں فارسی، عربی اور پراکرت۔ اور اس میں پراکرت کی حلاوت اور صنم آرائی، فارسی کی شگفتگی اور نشاط آرائی اور عربی کی صلابت اور معنی آفرینی کچھ اس تناسب، اس توازن اور ایسی ترکیب سے ریختہ اور آمیختہ ہیں کہ اس کی طبیعت میں قدامت پسندی کے ساتھ ساتھ جدت طرازی اور انقلاب آفرینی بھی ہے۔ اس کا تانا اگر ہندی ہے تو بانا عربی اور فارسی۔ اس کے ساز کا ٹھاٹھ اگر پراکرت ہے تو نغمہ عراقی۔ نے اگر ہندی ہے تو لے حجازی۔!

اردو کا مزاج انقلابی اور اس کی طبیعت جدت پسند ہے۔ وہ فنا نہیں ہو سکتی اسلئے نہیں کہ وہ مسلمانانِ ہند کے ذہنی جذبات اور مذہبی روایات کی حامل اور محافظ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ملک کی اس نشاۃِ ثانیہ اس حیاتِ نو، اس ذہنی انقلاب کی پیداوار ہے جس نے ہندوستان کو ذی حس، خود آشنا بنا دیا۔ جس نے اسکی خوابیدہ صلاحیتوں کو برانگیختہ کر دیا۔ جس نے اس کے مایوس اور پژمردہ ذہن کو امید اور ایک مستقبل خوش آیند کا پیغام دے کر رعنائی اور توانائی بخشی۔ جس نے اس ملک کے اقدارِ نو کے لئے جن کی جبینیں سجدوں کے لئے تڑپ رہی تھیں، ایک جامع اور حسین، پُرمعنی اور دلکش سجدہ گاہ مرتب کر دی۔ اُردو کی یہی خصوصیت اس کو زمانہ کی دستبرد سے بچائے گی اور اسی لئے اُردو کا مستقبل محفوظ اور اس کی ترقی لامحدود ہے۔ اور یقین کیجئے کہ یہ قول نہ مجذوبانہ بڑ ہے اور نہ حقیقت اور صداقت سے ایک والہانہ گریز۔ اس کی صداقت کا ثبوت ہے۔ خود اُردو کا مزاج اور اس کا وہ گہرا تعلق جو اس کو عربی اور فارسی جیسی ہمہ زندہ، تابندہ اور ترقی پذیر (پائندہ) زبانوں سے ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو ملاحظہ ہو زبان اُردو کا وہ انداز جس سے یہ ملک کے ایسے اقدار کی تشکیل اور تسکین کا کام بھی انجام دے رہی ہے جن میں سے بہت سے تو ابھی اُفقِ ذہنی پر نمودار ہی ہونے پائے ہیں۔ اس کی وضاحت بھی مختصراً سن لیجئے۔ ہمارے ملک میں اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا ایک اور ذہنی انقلاب کا آغاز کرتی ہے۔ اس انقلاب نے ہمارے ملک کے ذہن اور نفس کو عمل اور ردِ عمل کے ایک عجیب سحر آفریں اور حیات سوز کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ یہ کشمکش برابر جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ ملک اپنے ایمان و ایقان کی فردوسِ گم شدہ کو پھر نہ پالے یا ایک نئے ایمان و ایقان کی دوسری فردوس نہ تعمیر کر لے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہوگا لیکن قیاساً اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ملک ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کروٹ بدل رہی ہے۔ اور ایک ایسے بسیط اور وسیع انقلاب کی تیاری کر رہی ہے جو اس جہان کے زمین و آسمان کو بالکل ہی بدل دے گا۔ ہمارے ملک کے سامنے ادارے اس کشمکش سے اثر پذیر ہو رہے ہیں۔ ہماری حیات کے اقدار بھی اس کشمکش کے مقناطیسی اثر سے لرزاں اور رقصاں ہیں اور ان کا

ثبات اور استواری اضطراب اور بے چینی میں ان کا اعتماد اور خودداری بے عقیدگی اور افسردگی میں بدل رہا ہے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں پر اس کا کس درجہ شدید کسقدر ہوشربا، صبر آزما اور ایقان سوز اثر پڑ رہا ہے اسکا اندازہ انہیں کو ہو سکتا ہے جن کو ان نوجوانوں سے کسی قسم کے قریبی تعلق کا موقع ملا ہے۔ ہم میں سے وہ لوگ جنکے نفس اس حیات سوز آگ سے کبھی آشنا نہیں ہوئے، جو وفاداری بشرطِ استواری ہی کو عین ایمان تصور کرتے ہیں، جن کے دل فُقدانِ ایمان و ایقان کے تباہ کن عذاب سے ناواقف ہیں۔ اکثر ان بدنصیب نوجوانوں کو غضب اور کراہت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے ذہنی اور جذباتی واردات کی۔ جن کے اظہار کے لیے یہ نوجوان ہر قسم کی کوشش کرنے پر (چاہے وہ حسین ہو یا قبیح، محمود ہو یا مذموم) مجبور ہیں۔ فحاشی اور عریانی بدعقیدگی اور بے دینی کے تازیانوں سے تواضع کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرتے اور کہتے ہوئے ہم اس کشمکش کو بھول جاتے ہیں جس کا تذکرہ میں اوپر کر آیا ہوں جو ایک اژدگر کی طرح ہمارے ان نوجوانوں کے ذہن و دماغ کو ایک جانگسل گرفت میں محصور کئے ہوئے ہے۔ ہم لوگ اگر ان کی رہنمائی اور ہدایت نہیں کرتے تو غصہ اور تنفّر سے تو اجتناب کریں۔ اور ان کی نفسیاتی گتھیوں اور جذباتی و ذہنی مدوجزر کو قبولیت کا شرف اگر نہیں تو سمجھنے کی کوشش کا فخر تو بخشیں۔ میں ادبِ نو کی لغزشوں کی۔ جن کو میں ناگزیر اور پختہ کاری کا ایک ذریعہ سمجھتا ہوں۔ حمایت نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ ان کو غیر متعصب شفقت آمیز اور ہمدردانہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی درخواست کر رہا ہوں۔ اس درخواست کے دو محرک ہیں۔ ایک تو وہ جذبۂ لطف و کرم جو ہر بڑے کے دل میں اس کے چھوٹے کے حال پر ہوتا ہے جو ہمیشہ چھوٹوں کی شوخیٔ طبع کو اپنی شگفتہ متانت سے ادب آشنا بناتا ہے جو گرمیٔ شباب اور اس کی شعلہ سازیوں کو شیب کی دانشمندانہ تردستیوں سے حیات جاوید کے درجۂ حدت پر لاکر قائم کرتا ہے اور جو نوجوانوں کی انانیت اور الغو کی والہانہ اور باغیانہ سرفروشی کو ایمان اور عقیدہ کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ دوسرا محرک اس درخواست کا اُردو کی ان انقلابی صلاحیتوں پر جو ادبِ نو کے ذریعہ رونما ہو رہی ہیں۔ ایک ناقدانہ اور اصلاحی نظر کی حاجت اور ضرورت ہے۔

جیسا میں اوپر عرض کر آیا ہوں اُردو کی یہی صلاحیت اس کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے اور اس کی آئندہ بقا کی ذمہ دار ہے۔ اسی صلاحیت کی بنا پر وہ اقدار کی ترجمانی اور اظہار پر حاوی ہے اور یقین کیجیے کہ اُردو کے مستقبل کا تعلق انہیں حضرات کے قلم سے ہے۔ پرانے اقدار اور عقائد آئے دن ادبِ نو کے خام اور نیم پختہ مظاہروں پر گالیوں کی بوچھار تو کرتے رہتے ہیں لیکن اس کی موجودہ کشمکش حیات اور مستقبل کے اقدار کی اس ترجمانی پر کم از کم جو فن اور اخلاق دونوں حیثیتوں سے بلند ہو کبھی دو زود نہیں بھیجتے۔ بہرحال اس گریز سے میرا مدعا اردو زبان کی ایک ایسی خصوصیت اور صلاحیت کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا تھا جو ادبِ نو میں رونما ہو رہی ہے اور جس کو ادبِ نو کے نقاد اکثر اور بیشتر اگر فراموش نہیں کرتے تو پس پشت ضرور ڈال دیتے ہیں۔

یہ ہے اردو کے اصلی مزاج اور افتادِ طبیعت کا ایک پہلو جس کو میں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری اس سعیٔ ناتمام سے آپکو کم از کم اس کا اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ اردو ہندی کا موجودہ قضیہ، اردو اور ہندی نوازوں کی باہمی جنگ و جدل کس درجہ بعید از حقیقت اور اوہام پرستی کا کس قدر مضحکہ انگیز اور بے سود مظاہرہ ہے۔ نہ اردو خطرہ میں ہے اور نہ ہندی۔ نہ ہندی اردو کو فنا کر سکتی ہے نہ اردو ہندی کو۔ یقین کیجئے کہ جتنے حربے اردو کے خلاف استعمال کئے جا رہے ہیں وہ اس کے لئے مہمیز کا کام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

حضرات! یہ ہے وہ مہتم بالشان مستقبل دوست اور انقلاب آشنا زبان جس کی حفاظت کے لئے آپ صرف چند تجاویز پاس کر کے اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ فرض کی نیم شناسی، آپ مجھے معاف کریں اگر یہ عرض کرنے کی جرات کروں کہ نہ آپ کے شایانِ شان ہے اور نہ اردو کے۔ اردو کو اس باب میں آپ کے فرض کی کم نظری اور مقصد کی تنگ دامانی دونوں سے بجا اور درست گلہ ہے۔ اردو کے تحفظ ہی کا نہیں بلکہ اس کی ترقی اور ترویج کا فرض بھی آپ عائد ہوتا ہے اور اس فرض کو انجام دینے کیلئے آپکو ایسے مقاصد کو متعین کرنا ہے جو اس فرض کی تمامیت کے ضامن ہوں اور ایسی تجاویز اختیار کرنی ہیں جو اس فرض کی تکمیل بطرز احسن کر سکیں۔ ان مقاصد کا متعین کرنا اور ان تجاویز کی تشکیل کرنا اسقدر اہم ہے کہ اس جرات رندانہ کے باوجود بھی جو اپنے حفظ ما تقدم کیلئے مجھے یہاں اختیار کرنی پڑی ہے۔ اس معاملہ میں آپکو صلاح دینے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ میں نے اس خطبہ میں نبض شناسی کی کوشش (جسکی کامیابی کا اندازہ میں آپ ہی پر چھوڑتا ہوں) ضرور کی ہے لیکن معالجہ کے ارادہ سے نسخہ تجویز کرنے کے لئے قلم اٹھانا ایک ایسا اقدام ہو گا جسکی متحمل میری جرات رندانہ بھی نہ ہو سکیگی اغلب ہے کہ اس کے پیر ڈگمگا جائیں اور اس کی لغزش پا مجھے اپنے حدود سے باہر پھینک دے۔ تاہم از رہِ امتثالِ امر و تقاضائے روایات صدر نشینی چند مشورے، میری تلخ نوائی کو معاف کرتے ہوئے سن لیجئے۔

اردو کا تعلق اس دوآبہ سے جس کو عرف عام میں یو۔پی۔ کہتے ہیں قلبی ہے اس معاملہ میں دلی کو میں یو۔پی۔ کا ہی ایک جزو گردانتا ہوں یہ اور بات ہے کہ ملک کی سیاسی اور مالی تقسیم میں دلی، یو۔پی۔ سے باہر ہے لیکن اصل میں ایک دلی کیا سارے ملک کی تہذیب و تمدن مذاہب و ملل کا گہوارہ اور ارباب جان کا ملجا و ماویٰ، ایک بڑی حد تک یہی دوآبہ ہی رہا ہے۔

علم و ادب کے تاجداروں نے دلی سے نکلکر اسی خطہ میں جائے عافیت پائی ہے۔ دلی کے اقطاب ادب بھی یو۔پی کی ادب نوازی کے رہین منت رہے ہیں۔ اردو کی نشر و اشاعت ترقی و ترویج میں بھی یو۔پی کسی سے کم نہیں رہا ہے۔ اس زبان کی آئندہ ترقی میں بھی انشاء اللہ اسکا حصہ نمایاں رہے گا۔ یو۔پی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی اس معاملہ میں فرض شناسی قابل صد آفریں ہے کہ اس نے اپنی آغوش میں اردو کانفرنس کو جگہ دی ہے اور اپنی روایات عمل کوشی سے اس نونہال کی پرورش کا ذمہ لیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس صوبہ میں شاید یہی ایک ایسا منظم ادارہ ہے جو کاروباری نفع اور مصلحت سے بالاتر ہو کر اردو کی ترقی کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے۔ اسلئے میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ یہ کانفرنس ایک مختصر لیکن جامع کمیٹی منتخب کرے جس کے رکن اردو کے چند مستند اور ماہر ادیب اور تعلیم کے چند پختہ کار مفکر ہوں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہو گا کہ وہ

س اردو کانفرنس کے مقاصد کا تعین اور اُن تجاویز کی تشکیل کرے جو کانفرنس کو اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے اختیار کرنی ہیں۔

میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ صوبہ کے مختلف ادارہائے نشر و اشاعت، ایک مرکزی جماعت میں منسلک ہو کر اردو کی خدمت، یک جہتی اور یک قلبی سے کریں۔ اس الحاق کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ادارے، اپنی انفرادیت اور خصوصیت کو ضائع کر دیں اور نہ یہ کہ وہ اپنے ذاتی اغراض اور مقاصد کو فراموش کر دیں۔ بلکہ ان سب سے ماورا ایک منزل اور بھی ہے جہاں پہنچ کر اردو کی خدمت کا ذوق، اس کی ترقی اور ترویج کا شوق، ان سب اداروں کو (باوجود اُن کے مقاصد اور اغراض کی غیر ہم آہنگی کے) اس مبارک کام میں دوش بدوش لا کھڑا کر سکتا ہے۔ ایسی مرکزی جماعت کا منظم ہو جانا، جو اس صوبہ کے ہر اُس ادارہ کی دیکھ بھال کر سکے جو کسی حیثیت سے بھی اُردو کی خدمت کر رہا ہے، اردو دوست ارباب ہمت کے لئے مشکل نہ ہونا چاہئے۔ یہ مرکزی جماعت دُور افتادہ اور پسماندہ اداروں کو اُبھار سکتی ہے۔ ترقی یافتہ اداروں کو اور زیادہ اُجاگر کر سکتی ہے۔ نشر و اشاعت کے اور راستے نکال سکتی ہے اور ان مقاصد اور تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں بہت کچھ مدد کر سکتی ہے جو متذکرہ بالا کمیٹی پیش کرے گی۔

تیسرا مشورہ پیش کرتے ہوئے میں خائف بھی ہوں اور سراسیمہ بھی۔ خائف تو اس لئے کہ اس مشورہ کا تعلق میرے خود اپنے پیشے سے ہے اور سراسیمہ اس واسطے کہ پیشہ وروں کے اس جلسہ میں پیشہ ورانہ بات ذرا سخن گسترانہ بات ہو گی۔ لیکن مجھے لب کشائی پر مجبور کرتی ہے، ہمارے تعلیمی اداروں سے نکلے ہوئے اُن فرزندانِ اُردو کی محرومیٔ قسمت جو اردو ادب سے ناآشنا، جذبات کے اس توازن تزکیہ اور تہذیب سے عاری، جو ادب اور اس کا صحیح وجدان ہی پیدا کر سکتا ہے۔ نشاطِ حیات کے اُن سوتوں سے بے خبر جو سرزمینِ ادبیات سے پھوٹ پھوٹ کر بہتے ہیں اور جو زندگی کی بدمزگی، بے کیفی، افسردگی اور شوق کی وارفتگی سے اُکتا کر زندگی کے وہ اقدار قبول کر لیتے ہیں جس سے نہ خدا ہی ملتا ہے نہ صنم۔ خسارۂ دنیا و دین کا یہ مظاہرہ بھی کس درجہ بصیرت افروز ہے۔ مجھے یہاں اپنی تعلیم اور اس کے نظام کی محرومیوں سے سروکار نہیں۔ یہ تو (خدا خوش رکھے ہمارے نکتہ چینوں کو) اب زبان زدِ عام ہیں۔ ہندوستان کا کونسا جلسہ کونسا اجتماع ہے۔ چاہے وہ سیاسی ہو چاہے مذہبی۔ تجارتی ہو یا حرفتی۔ جہاں تعلیم پر صفِ ماتم نہیں بچھائی جاتی اور جہاں اس کا جنازہ نہیں اُٹھایا جاتا۔ میری دانست میں تو ہمارے پیشے کی سب سے بڑی محرومی یہ بھی ہے کہ ہر کس و ناکس اپنے کو اس پر اعتراض کرنے کا مستحق اور اس پر نقادانہ نظر ڈالنے کا اہل سمجھتا ہے۔ اس بد مذاقی کا ایک نتیجہ صریح تو یہ ہوتا ہے کہ تنقید، تعلیم کی اصلی محرومیوں سے عموماً ناواقف رہتی ہے اور تعلیم کی اصلاح ہمیشہ کم نگہی، تنگ حوصلگی اور بیرہات نوازی کی نذر ہو جاتی ہے۔

حضرات! اس ہرزہ سرائی کی معافی چاہتا ہوں لیکن بعض اوقات خار کا تصور بھی کبلہ کی یاد دلا دیتا ہے۔ بہرحال ہمارے تعلیمی اداروں میں مادری زبان کی حیثیت کو اونچا کرنا، اس کی تعلیم اور اندازِ درس و تدریس کو فرسودہ اور بیش پا افتادہ

طریقوں سے نجات دلانا، اسکے پڑھانے والوں کی توقیر میں معتدبہ اضافہ کرنا، اور ان کے مفاد کی راہیں نکالنا یہ سب بھی آپ کی کانفرنس کے فرائض میں سے ہے۔ آپ کو یہ سن کر یقینی مسرت ہوگی کہ محکمۂ تعلیم نے مادری زبان اور اس کے پڑھانے والوں کی اصلاح اور فلاح پر گذشتہ دو تین سال میں کافی دھیان دیا ہے اور انشاء اللہ وہ وقت قریب ہے جب مادری زبان کے پڑھانے والوں کی حیثیت ہمارے تعلیمی اداروں میں دوسرے مضامین کے پڑھانے والوں سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ یہ ایک بڑی حد تک نتیجہ ہے جناب ٹھاکر نہپال سنگھ صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات یو۔پی کی مادری زبان نوازی کا اور انکی مساعی جمیلہ کا۔ جو وہ برابر اس کی ترقی کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ کوششیں اسی وقت مشکور ہو سکتی ہیں جب مادری زبان کے موجودہ اساتذہ کی رہنمائی اور ٹریننگ کا کوئی معقول بندوبست ہو۔ اور ان کے استفادہ اور ہدایت کے لئے کتابیں ہوں۔ افسوس اور شرم کے ساتھ اس کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ مادری زبان کے پڑھانے پر جو کتاب آجکل اس صوبہ میں رائج ہے وہ انگریزی زبان میں ہے اور اسکو لکھا ہے ایک انگریز نے۔ میں اس کانفرنس کے ذریعہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے شعبۂ اردو اور ٹیچرس ٹریننگ کالج کی معرفت ایک ایسے رفریشر کورس کی طرح ڈالیں جس میں ہمارے اسکول اور کالجوں کے اردو پڑھانے والوں کو کم از کم تین یا چار ماہ کے لئے ٹریننگ دی جا سکے۔ اس قسم کے کورس سال میں کم از کم ایک بار ضرور منعقد کئے جائیں اور مسلم یونیورسٹی کی اردو نوازی سے یہ درخواست نامناسب نہ ہوگی کہ اس کا شعبۂ اردو اس کے ٹیچرس ٹریننگ کالج کی معاونت سے زیادہ نہیں تو کم از کم ایک ایسی کتاب کی تصنیف یا تدوین کا بندوبست کرے جو صحیح معنوں میں اردو پڑھانے والوں کی ہدایت اور رہنمائی کر سکے۔ مجھے امید ہے کہ میری درخواست شرف قبولیت حاصل کرے گی۔

اس سلسلہ میں یہ بھی سن لیجئے کہ ان باتوں سے "وصل کی تدبیریں" تو شاید بن جائیں لیکن ان سے اردو کی تقدیر بدلتی نظر نہیں آتی۔ اسکا نسخہ تو وہی ہے جو بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے پیش کیا ہے۔ وقت کی نبض شناسی اور اردو کی جامعیت کا اظہار و احساس اس تجویز سے زیادہ بہتر نہیں ہو سکتا جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے شمالی ہند میں ایک اردو یونیورسٹی کے قیام کے تخیل کی صورت میں پیش کی ہے اور یہ بھی سن لیجئے کہ اس یونیورسٹی کا قیام محض اردو ہی کی ترقی کا باعث نہیں ہوگا بلکہ ہمارے ملک کے ذہن کو ان قیود سے نجات دینے والا ہوگا جو اسپر اس وجہ سے مسلط ہو کر رہ گئی ہیں کہ ہم نے ابتک اور مختلف علوم محض انگریزی زبان ہی میں پڑھے اور سیکھے ہیں۔ شاید اسوقت ہم لوگ اس نجات کے نتائج کا اور اسکے ان اثرات کا جو ہماری آئندہ نسلوں کی ذہنی بالیدگی پر پڑے گا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن یقین کیجئے کہ ایسی قومی سیرت کی تشکیل۔ جو اپنے اسلاف اور ان کے خوابہائے گراں کی تعبیروں سے شرمندہ ہونے پر مجبور نہیں ہے۔ اسی قسم کی درسگاہیں کر سکتی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ جس سب کمیٹی کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں وہ اس تجویز کی اہمیت کا قرار واقعی احساس کریگی اور اس مقصد کی تاسیس اور تکمیل کی ایسی تجاویز پیش کریگی جن سے بابائے اردو کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

حضرات! منزل آخر اور خطبۂ صدارت تمام ہونے کو ہے شمع محفل بھی افسردہ ہو چلی ہے اور مجلس کی وہ جماہی بھی۔ اس جل جلاؤ میں ایک آخری مشورہ سنکر میری مغفرت کی دعا کیجئے۔ اس مشورہ کا ماحصل ہے اردو ادب کی تنقید و تبصرہ، نشر و اشاعت کے صحیح پیمانہ کی